Al-Hikmat: A Journal of Philosophy
Volume 38 (2018) pp. 93-119

بیسویں صدی میں برصغیر میں اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل اور اس پر سرسید واقبال کے اثرات

THE ISLAMIC WORLDVIEW IN THE 20th CENTURY SUBCONTINENT AND THE EFFECTS OF SIR SYED AND IQBAL ON IT

Muhammad Rasheed Arshad
Lecturer, Department of Philosophy,
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
PhD Scholar, University of Karachi, Karachi
E-mail: *rarshadpk@gmail.com*

Awais Shoukat
PhD Scholar, Institute of Islamic Studies
University of the Punjab, Lahore, Pakistan
E-mail: *m.awaischeema1@gmail.com*

Abstract: In the 20th century, the Western episteme became dominant at a global level and the perspective that was developed by the West, owed to its recent century's development in knowledge, regarding *God*, the *human being*, and *universe* and was on one hand the cause of an annihilation of the traditional / orthodox perspectives, and on the other hand a reason to create an ideological turmoil in the rest of the world. Consequently, not only did the West became an ideal in matters of advancement in science and technology, but the Western epistemological theory, rationalism and empiricism, became the sole measure of all realities, including religious dogmas. In colonial subjugation Sir Syed's episteme appeared, on the one hand, in a scenario where there are is a skepticism of the Muslim mind about its own tradition and on other hand, there is an alarming ignorance about the destructiveness of western civilization and the hollowness of the modern knowledge structure. This is the context where comes Iqbal, who not only have a deep sense of the grandeur of his civilization but also a thorough understanding of the dangers of the modern intellectual enterprie. This article intends to explore the constituent facets of the Muslim worldview in the contemporary world and in this context presents a comparative analysis of the thoughts of Sir Syed Ahmad Khan and Muhammad Iqbal.

Key Words: Worldview, Narrative, Muslims Civilization, Ideology, Episteme, Western Civilization.

تعارف

بر صغیر میں مسلمانوں نے تقریبا" ہزار سال حکومت کی۔ لیکن انیسویں صدی میں اس اقتدار کاانگریزوں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ اس دوران نا صرف برصغیر بلکہ قریب قریب تمام اسلامی دنیا کسی نہ کسی مغربی قوت کے زیر تسلط چلی گئی۔ اسلامی تہذیب، جس نے لگ بھگ ہزار سال تک دنیا کے بڑے حصے پر حکومت کی تھی اور دنیا کوکار جہاں بانی و جہاں بینی[1] کے حوالے سے بہت کچھ دیا تھا، اس غلبہ سے اس کے تار و پور بکھر کر رہ گئے۔ اسلامی تہذیب کے زوال میں اندرونی عوامل تو کارفرما تھے ہی لیکن مغرب میں آنے والے علمی انقلاب اور اس کے نتیجے میں ہونے والی سائنسی ترقی بھی اس کی وجہ بنی۔مغرب کی یلغارابتدا میں محض سیاسی تھی لہٰذا مسلمانوں کی طرف سے ردعمل بھی اسی میدان میں ہوا اور تحریک شہیدین کی طرز کی جدو جہد کم و بیش ہرملک میں شروع ہوئی اور ہر جگہ دنیاوی حوالے سے ناکام بھی ثابت ہوئی۔اس کے بعد مغربی استعمار جب اپنے پنجے گھاڑ چکا تو اگلا حملہ پھر علمی و فکری تھا۔ برصغیر میں 1857 کی جنگ آزادی کے بعد جب باقاعدہ برطانوی حکومت قائم ہو گئ تو پھر اسلامی نظریہ حیات براہ راست جدید فکر کے زیر اثر آگیا۔ اس دوران مسلمانوں میں موجود شکست خوردگی نے ناصرف ان کے عقائد بلکہ دنیا و کائنات کے حوالے سے ان کے تصورات کے حوالے سے ان کو تذبذب کا شکار کر دیا اور آسمان مغرب سے طلوع ہونے والے علم کا حصول نا صرف دنیاوی کامیابی کے لیے ناگزیر قرار پایا بلکہ اس سے بڑھ کر بہت سوں کے نزدیک ایک دینی ضرورت بھی قرار پایا۔ لیکن چونکہ اسلامی تہذیب کو اپنا سنہرا دور گزارے ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا لہٰذا غلبہ کی خواہش اور اس حوالے سے احساس کمتری ابھی لاشعور میں کہیں موجود تھی۔لیکن ساتھ ہی کمزوری اور مایوسی کی کیفیات بھی دامن گیر تھیں۔ لہٰذا یہ بنیادی سوال اس دور کے اصحاب فکر کے سامنے تھا کہ استعمار سے تعامل کس حد تک اور کیونکر ہو۔ ایک دوراہا سامنے تھا کہ ماضی سے پیچھا چھڑا کر حال کو سنوار لیا جائے جبکہ دوسرا رستہ ماضی کے ساتھ ربط اور استعمار سے مکمل بے اعتنائی برتنے کا تھا۔

---

[1]ابوالحسن علی ندوی ، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، (کراچی : مجلس نشریات اسلام، 1986)

اپنے یہاں اول الذکر فکر کے سرخیل سر سید احمد خان اور ان کے اصحاب تھے جبکہ دیوبند نے اپنے لیے اصحاب کہف کی سنت پر عمل کرتے ہوئے دوسرے رستے کا انتخاب کیا۔ پہلی فکر کے زیر اثر علی گڑھ کالج اور اس جیسے ادارے قائم ہوئے جن کی وجہ سے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے حصول کا عمومی غلغلہ ہوا اور مسلمانوں کا اچھا خاصہ حصہ دنیاوی طور پر پسماندگی کہ اس کیفیت سے نکل آیا جس میں وہ 1857 کی جنگ آزادی کے بعد چلا گیا تھا۔ بعد میں اسی طبقہ نے مسلمانان برصغیر کی سیاسی و فکری راہنمائی کا بیڑا اٹھایا اور آزادی کے حصول کے لیے کامیاب جنگ لڑی۔ دوسری طرف ایک متوازی لہر دیوبند اور دیگر دینی مدارس کی تھی جو معاشرے کے عمومی دھارے سے الگ تھلگ قال اللہ اور قال الرسول میں مگن رہے۔ان دو متوازی نظاموں کا فوری اثر تو یہ ہوا کہ اسلامی فکر میں دین و دنیا کی جدائی پیدا ہو گئی اور مسلمانوں کی سیاسی قیادت اور مذہبی قیادت الگ الگ ہو گئی۔ ابتدا میں یہ محض لائحۂ عمل کا اختلاف تھا جو مرور زمانہ سے بعدالمشرقین میں بدل گیا۔حتیٰ کے ایک دوسرے کے حوالے سے تحقیر و توہین کے جذبات ذہنوں میں پیدا ہو گئے۔ نہ زندگی کے آئیڈیل ایک رہے اور نہ ہی نظریہ حیات ایک رہا۔ اس تقسیم نے اسلامی سماج میں ایک مستقل خلیج پیدا کردی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

لیکن اس کا زیادہ بڑا اور دیر پا اثر یہ ہو ا کہ مسلمانان بر صغیر کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ خدا، کائنات اور انسان کے حوالے سے مغربی تصورات جو کہ سائنس کے زیر اثر پروان چڑھے تھے کو برحق سمجھنے لگا اور مغربی تصور علم جس میں کلیدی اہمیت عقل اور حواس خمسہ کی تھی، ہی قبول حق کا واحد اور حتمی معیار قرار پائے۔ جو لوگ عقیدے اور وحی کی برتری کو دل سے ٹھیک سمجھتے تھے، دماغ ان کے بھی مغربی علوم کی حقانیت کے قائل ہو گئے۔ لہٰذا ترقی کا معیار، نظام تعلیم، سماجی اقدار، احساسات، ریاستی نظام، غرض ہر حوالے ایک آئیڈیل کی حیثیت مغرب کو حاصل ہو گئی۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ بر صغیر میں اس فکر کے فروغ میں سب سے بڑا حصہ سر سید احمد خان کا ہے اور بقول احمد جاوید ا ن کو برصغیر میں جدید مسلم تہذیب کے حوالے سے وہی مقام حاصل ہے جو قدیم یونان میں افلاطون کو حاصل تھا۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان کچھ اور لوگ بھی تھے جو جدید علوم سے واقف ہونے کے ساتھ اپنی تاریخ اور علوم سے بھی بہرہ ور تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کے اجتماعی مسائل کے حل کے لیے مغرب کی اندھی تقلید کے بجائے اس سے استفادہ پر زور کے ساتھ ساتھ مغربی فکر و فلسفہ میں موجود خرابیوں کو پہچاننے پر بھی زور دیا۔ اور جدت اور روایت کے امتزاج پر زور دیا۔ اس فکر کے حاملین میں علامہ شبلی، سید امیر علی، سید سلیمان ندوی، اکبر آلہ آبادی وغیرہ نمایاں افراد تھے لیکن سب سے زیادہ قبول عام جس کے حصے میں آیا اور اپنے یہاں تفہیم مغرب کے حوالے سے جس کا دور دور تک ان کے معاصرین میں کوئی ثانی نہ تھا وہ شخصیت علامہ محمد اقبال کی تھی۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ اقبال کے ہاں جو روایت پر نقد ہے اس کو تو خوب قبولیت ملی البتہ جو حصہ مغرب پر نقد اور اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل میں روایت کے کردار سے متعلق تھا وہ عمومی پذیرائی سے محروم رہا۔ اس مقالے میں اس بات کو سمجھنے کی کوشش کی جائے گی کہ برصغیر کے مسلمانوں کے نظریہ حیات کی تشکیل جب 1857 کے بعد انگریز استعمار میں ہوئی تو اس کے اجزائے ترکیبی کیا تھے۔ نیز اس حوالے سے فکر سر سید اور فکر اقبال کا تقابل کر کے یہ جائزہ لیا جائے گا کہ اپنے یہاں حقیقی قبولیت کس فکر کو حاصل ہوئی۔

جدید مغربی تہذیب کی فکری بنیادیں اور نظریہ حیات کا اسلامی نظریہ حیات سے تقابل

تمام مذاہب کی طرح،اسلامی تعلیمات کا مرکز و محور بھی انسان ہے۔قرآن و سنت کی تعلمات کا مرکز و محور انسان کی دونوں جہانوں میں بھلائی و کامیابی ہے۔ قرآن مجید سے حتمی طور پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ کی واحد ذات ہی اس کائنات میں Absolute Reality ہے۔ انسان اسی کی پیدا کردہ مخلوق ہے اور یہ کائنات بھی اللہ کی تخلیق ہے اور اس کائنات کا انجام قیامت ہے جس کے بعد ایک نئی اور اصل زندگی شروع ہو گی۔ اور یہی جوابات مل کر ایمان بناتے ہیں۔ ان سوالات کا تعلق چونکہ ما بعد از طبیعاتی مسائل سے ہے لہٰذا انسان اپنی عقل و حواس کو استعمال کرتے ہوئے ان کے یقینی جوابات تک نہیں پہنچ سکتا۔ اگرچہ یہ صلاحیتیں وحی میں بیان کیے گئے حقائق کو انسان کے اندر جاگزیں کرنے میں مد و معاون ہیں۔اسی طرح قرآن انسان کوکائنات کا مرکز اور اللہ تعالیٰ کی بہترین تخلیق قرار دیتا ہے جیسا کہ سورۃ التین میں فرمایا گیا :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ

اور ہم نے انسان کو بہترین نہج پر پیدا کیا[2]

اسلامی نقطہ نظر سے نہ تو یہ کائنات آپ سے آپ وجود میں آ گئی اور نہ ہی انسان سمیت دیگر مخلوقات۔یہ سارا عمل با مقصد اور اللہ کی مشیت اور اس کے اذن سے ہو رہا ہے۔ انسان کا مقصد تخلیق قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ

اور ہم نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔

اس آیت مبارکہ میں لفظ "عبادت" کا مطلب اللہ کی کامل اطاعت اسکی محبت کے جذبے سے کرناہے۔قرآن انسان کی تخلیق پر روشنی ڈالتا ہے کہ اللہ نے انسان کو گارے اور مٹی سے پیدا دفرمایا اور اس میں اپنی روح میں سے پھونکا[3] تو اس طرح خاک و نور کے امتزاج سے انسان کی تخلیق ہوئی اور وہ اس قابل ہوا کہ اللہ نے اس کو زمین پر اپنا خلیفہ مقرر کر دیا۔ گویا انسان اس زمین پر اللہ کا نائب ہے۔

انسان میں خاص اپنی روح میں سے پھونکنے کے علاوہ اللہ نے انسان کو علم عطا کیا اور اس میں آگے سے آگے بڑھنے کی صلاحیت عطا فرمائی۔ اس کو شعور دیا، داخلی راہنمائی کے لیے ضمیر ودیعت کیا، عمل کی آزادی دی اور حسن و کمال کی جانب ترقی کرنے کاذوق بھی عطا فرمایا۔انسان کی یہی خصوصیات اسے دیگر مخلوقات سے ممتاز کرتی ہیں اور اسے اللہ کی صفات کا ایک نامکمل اور ادھورا عکس بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام روایتی تہذیبیں اس بات پر متفق ہیں کہ انسان محض ایک مادی جسم نہیں بلکہ انسان کی حقیقی عظمت اس بات میں مضمر ہے کہ وہ روحانی اور اخلاقی وجود کا حامل ہے۔یہ

---

[2] التین،95:4

[3] (فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ)الحجر،15:29

روایتی تصور انسان کو تمام تر مخلوقات سے اشرف اور کائنات کا مرکز قرار دیتا ہے لیکن گذشتہ 4-5صدیوں میں علم میں بتدریج ترقی نے اس روایتی " تصور انسان " کا شیرازہ بکھیر دیا اور اسے ایک حیوان کی سطح تک گرا دیا۔

کسی بھی تہذیب کے تحت سماج میں تعلیم اور تربیت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ تہذیب انسان کو کس نقطہ نظر سے دیکھتی ہے۔تاریخی حوالے سے انسانی فطرت کا مطالعہ ان اہم ترین سوالات میں سے ایک ہے جس کے ساتھ انسان کو پا لا پڑا ہے۔ جب سے انسان کے شعور نے آنکھ کھولی اور اس نے باقاعدہ سوچنا سمجھنا اور غو و فکر سے اپنے گرد و پیش کی ایک مربوط توجیہ پیش کرنے کی سعی کی تو اس کی متجسس طبیعت نے اس کے سامنے مختلف سوال اٹھائے۔ جن بنیا دی ترین سوالوں سے اس کو واسطہ پڑا اور ہر دور میں جن سوالوں کا جواب دینے کی کچھ نہ کچھ کوشش کی گئی وہ انسان کی حقیقت اور اس کائنات سے اس کے ربط و تعلق سے متعلق تھے[4]۔ یعنی کائنات کیا ہے ؟ انسان کیا ہے؟ اور حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ مذہبی روایت کا بجا طور پر یہ دعویٰ ہے کہ جب اولین انسان اس زمین پر آیا تو وہ الہامی ہدایت کی روشنی میں میں ان سوالات کے جواب جانتا تھا،چونکہ ان سوالات کا تعلق مابعد ازالطبیعات سے ہے تو صرف مابعد الطبیعاتی مآخذ ہی ان سوالات کے صحیح اور ٹھوس جواب فراہم کر سکتا تھا۔ البتہ انسانی تاریخ کا طائرانہ جائزہ یہ بتاتا ہے کہ زیادہ تر زمانہ انسان نے وحی سے بے خبری ہی میں گزارا۔لہٰذا ان سوالوں کے حتمی جواب کے لیے قدیم انسان نے بھی ٹھوکریں کھائی اور جدید انسان بھی ان کے جواب کی تلاش میں ان بھول بھلیوں میں پڑا کہ خود انسان کو اس کے شرف سے محروم کر دیا۔

---

[4]اسی کو ورلڈ ویو کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ بنیادی سوال آتے رہے ہیں۔

- حقیقت مطلقہ کیا ہے؟ What is Absolute Reality
- انسان کیا ہے؟ What is Man
- کائنات کیا ہے؟ What is Universe
- علم کیا ہے؟What is Knowledge

پندھویں سے اٹھارویں صدی کے دوران علم کے مختلف شعبوں میں ترقی نے تاریخ کا دھارا ہی بدل دیا۔ معلوم تاریخ کی حد تک انسان کا اتنے بڑے فکری انقلاب سے گزرنے کا کوئی اور واقعہ نہیں ملتا۔ گلیلیو، اور نیوٹن وغیرہ کی دریافتوں کی بدولت سائنس اس قابل ہوگئی کہ کائنات کی حقیقت سے متعلق ایک نیا تناظر دے سکے۔ پہلے [5] Copernicusاور بعد میں Galileo[6] نے یہ ثابت کر دیا کہ کا ئنات کا مرکز زمین نہیں (Geocentric) بلکہ سورج ہے(Heliocentric) تو اس کی براہ راست زد مسیحی عقائد پر پڑی۔، اب ہوا یہ کہ عیسائیت نے توہمات پر مبنی جو ایک ڈھانچہ سا بنا رکھا تھا دھڑام سے زمین بوس ہو گیا۔ سائنس نے ان کے نظریات کو غلط ثابت کر دیا جس کے نتیجے میں سائنس اور مذہب میں کشمکش شروع ہو گئی۔ سائنس کو شیطانی علم قرار دے کر اس پر پابندی لگا دی گئی اور سائنس دانوں پر ظلم و ستم شروع کر دیا گیا۔ لیکن سائنس کے پاس چونکہ اپنے نظریات کو ثابت کرنے کے لیے تجرباتی دلائل تھے لہٰذا اس لڑائی میں عیسائیت شکست سے دوچار ہو گئی۔ ڈیکارٹ نے تشکیک سےعلم تک پہنچنے کا نظریہ دیا نتیجتاً تمام رائج نظریات و تصورات حتٰی کہ خدا کا وجود بھی مشکوک ہو گیا۔ لوتھر کی تحریک احیاء مذہب جو اگرچہ پوپ کے تسلط کے خلاف بغاوت تھی بعد کے وقتوں میں مذہب ہی کے خلاف بغاوت بن گئی۔ عقل اور اس کے بعد حسیت ہی واحد معیار حق بن گیا جس کی کسوٹی پر مذہب،اخلاقیات اور عقائد وغیرہ کو بھی پرکھا گیا اور انسان، کائنات اور حقیقت مطلقہ سے متعلق قدیمی نظریات کو بھی غلط ثابت کر دیا گیا۔ تخلیق کائنات اور انسان کی تخلیق اب محض ایک حادثہ قرار پائی جس کے پیچھے کوئی اصل مقصد کارفرما نہ ہو۔

رچرڈ ٹارنش لکھتا ہے کہ

> "The scientific liberation from theological dogma and animistic superstition was thus accompanied by a new sense of human alienation from a world that no longer responded to human

---

[5] Mathematically proved that the Universe is Heliocentric (Nicolaus Copernicus, 1473-1543).
[6] Invented Telescope (Galileo Galilei, 1564-1642).

values, nor offered a redeeming context within which could be understood the larger issues of human existence."[7]

ڈارون نے سائنس کی طرف سے بنے ہوئے نظریہ کائنات کی مزید توثیق کی اور اس کا نظریہ ارتقاء انسان کو اس کے ساتھ لگی رہی سہی عظمت سے بھی محروم کر گیا۔ اس کے " Survival of the Fittest " کے نظریے نے زندگی کے مادی نظریے کو مزید تقویت بخشی اور انسان اب زیادہ سے زیادہ ایک کامیاب جانور بن گیا جو اپنا وجود برقرار رکھ سکا۔فرائڈ نے ڈارون کے نظریے کو نفسیاتی دائرے تک وسعت بخشی اورانسان کے لاشعور کے اس کی شخصیت پر فیصلہ کن حد تک اثر انداز ہونے کے حوالے سے مدلل شواہد پیش کیے۔اس نے انسانی شخصیت کو لاشعورکا غلام کہا اور یہ لاشعور محض جنسی جذبہ کی تسکین کے گرد گھومتا ہے۔فرائڈ کے نظریے نے چند سالوں میں دنیا بھر سے توجہ حاصل کی۔ اس کے نتیجے میں انسان ایسا جانور قرار پایا جس کی زندگی کا واحد اور سب سے برا مقصد جنسی خواہش کی تسکین ہے۔ اور اگر یہ لامحدود خواہش تسکین سے محروم رہے تو انسانی شخصیت نامکمل رہتی ہے۔ ان نظریات کو اس قدر قبول عام حاصل ہوا کہ یہ کہا جاتا ہے کہ فرائڈ کے بعد کی دنیا اس سے پہلے کی دنیا سے مختلف تھی۔جیسے فرائڈ نے فرد میں لاشعور کو متعارف کروایا، مارکس نے سماجی لاشعور سے پردہ اٹھایا اورتمام تر انسانی کوششوں اور مشقتوں کو مادی ترقی کے لیے جدو جہد قرار دیا۔اس نے یہاں تک دعویٰ کیا کہ پوری تاریخ کے دوران انسان نے اپنے اعلی و ارفع مقاصد کو حاصل کرنے کی جو کوشش کی چاہے وہ انفرادی تھی یا اجتماعی، وہ اسکے اقتصادی حالات کی مسخ شدہ جھلک تھی۔

وہ تمام تر فکری ترقی جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ انسان جو کبھی اشرف المخلوقات اور کائنات کا مرکز تھا اور اس کی اصل اس کا روحانی و اخلاقی وجود تھا اس کو ایک ایساحیوان قرار پایا جس کی زندگی کا مقصد محض اپنی جسمانی ضروریات کی تسکین ہے۔ اس کی تخلیق کا نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اعلی و ارفع منزل۔اسی طرح علم کی تعریف میں عقل محض اور حواس خمسہ ہی مستند قرار پائے اور مذہب اور ما بعد الطبیعاتی حقائق بتدریج انسان سے غیر متعلق

[7] Richard Tarns, The Passion of Western Mind (London: Random House,1991), 112.

ہوتے چلے گئے۔ نتیجتا" اجتماعی معاملات میں سیکولرازم ایک بنیادی قدر قرار پائی اور انفرادی سطح پر آزادی مطلقہ کا وہ تصور فروغ پایا جس کے تحت انسان کو ہر طرح کی قدغنوں اور اخلاقی جکڑبندیوں سے آزاد کر دینے کو ہی شرف انسانیت گردانا گیا۔ انیسویں صدی کے آخری عشروں میں جب Nietzscheنے یہ دعویٰ کیا کہ خدا مرچکا ہے تو اسکا یہ دعویٰ نہ صرف اپنے دور کے لیے بلکہ آنے والی صدیوں کے لیے بھی جو راہ انسان نے اپنے لیے متعین کی اس کا ایک بے باک اظہار تھا۔اب انسان نے وجود کو الوہیت کے مقام لاکھڑا کیا ہے جہاں یہ کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔

وحی کے علاوہ روایتی طور پر دو اور ذرائع علم بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔ ایک کو عقلیت (Rationalism) اور دوسرے کو حسیت (Empiricism)۔ ریشنلزم کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ علم کا اصل مآخذ عقل انسانی ہے جو انسان کو فطرت کی طرف سے ودیعت کی گئی معلومات اور حسی مشاہدے سے علم حاصل کرتی ہے۔ یہ نظریہ قدیم یونانی فلاسفہ جیسے سقراط، افلاطون اور جدید فلاسفہ جیسے ڈیکارٹ کے ہا ں کارفرما رہا ہے۔ جب کہ اس کے برعکسEmpiricismکا نظریہ یہ ہے کہ انسان جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ اپنی حسیات (Sense)سے ادراک کرتا ہے۔اور یہ انسان کی پانچ حسیات (Five senses)کائنات کو جاننے کے لیے ضروری اور مددگار ہیں۔موجودہ مغرب صرف حواس خمسہ سے حاصل معلومات و حقائق کو ع ہی علم قرار دیتاہے۔جبکہ دیگر ذرائع بشمول وحی، حتیٰ کہ عقل بھی اب وہاں مستند ذریعہ علم نہیں۔ آکسفورڈ ڈکشنری کی بیان کردہ "علم" کی تعریف کے مطابق:

> "Facts, information and skills acquired through experience or education, the theoretical or practical understanding of a subject"[8]

تو اس تعریف میں بھی یہی بات سامنے آتی ہے کہ اصل علم اب ان کے ہاں " حسی مشاہدہ"یا Empiricismہے۔ مذکورہ بالا تحقیقات کی روشنی میں جو علمی فضا تخلیق ہو ئی اس میں مذہب سے نفرت اس کی بنیادوں میں شامل ہے اور اس بات پر تقریباً اتفاق کر لیا گیا ہے کہ تمام مذاہب علم

---

[8]Oxford Advanced Learner, 9th Edition

اور ترقی کے دشمن اور انسانی تاریخ کے تاریک ادوار کی یادگار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظریہ علم (Epistemology) مذہبی علم اور عقیدہ کو کچھ بھی علمی حیثیت دینے پر تیار نہیں۔ یوں علم بالوحی کا انکار کر دیا گیااور صرف علم بالحواس ہی کو اصل علم کا درجہ حاصل ہو گیا۔

مغربی فکر و فلسفہ کے زیر اثر جو ورلڈ ویو تشکیل پایا اس نے مذہبی حقائق کی پوری عمارت کو مسمار کر دیا اور بنیادی دینی عقئد کی جگہ کچھ نئے نظریات نے لے لی۔ چنانچہ حقیقت مطلقہ خدا کے بجائے کائنات، حیات اخروی کی جگہ دنیاوی زندگی،علم وحی کی جگہ حسی ادراک و عقل نے لے لی اور انسانجو اشرف المخلوقات سمجھا جاتا تھا، اس درجے سے گر کر محض ایکترقی یافتہ حیوان قرار پایاجس کی زندگی کا واحد مقصد اپنی خواہشات کی تسکین یازیادہ سے زیادہ اپنی معاشی حالت کو بہتر بنانا ہے۔ نیز سائنس کی حیثیت اس مہا بیا نیے (Meta Narrative) کی ہو گئی جو تمام تصورات و علوم کی حیثیت اور ان کی حقانیت و عدم حقانیت کا تعین کر سکے۔

سرسید کی فکر میں مغرب سے تعامل او ر اس کے اثرات

اس ورلڈ ویو کا جب بر صغیر کی اسلامی تہذیب سے تعامل ہو تو یہ لازمی امر تھا کہ اس کی اسلامی فکر کے ساتھ مغائرت کی وجہ سے اس کو یکسر رد کر دیا جاتا۔ لیکن بد قسمتی سے ۱۸۵۷ کی جنگ آزادی میں شکست اور اس کے بعد کی مسلسل توہین و تنقیص نے مسلمانان بر صغیر کو اس اعتماد سے محروم کر دیا تھا جو خارجی نظریات میں چھپی گمراہیوں کو پہچان کر ان کا رد کر سکے۔چنانچہ مسلمانوں کا ایک طبقے نےتو اس سیلاب کا سامنا کرنے کے بجائے قومی دھارے ہی سے خود کوالگ کر لیا اور قال اللہ و قال الرسول میں مگن ہو گئے۔ اس طرح وہ دین کے مجموعی ڈھانچے کی حفاظت میں تو کامیاب رہے لیکن سماجی و ملی معاملات سے رفتہ رفتہ بالکل غیر متعلق ہو گئے۔دوسرا طبقہ جو میدان میں موجود رہا او ر جس نے مسلمانوں کے سماجی و ملی مفادات کی حفاظتو راہنمائی کا بیڑا اٹھایا وہ تحریک علی گڑھ اور اس سے منسلک اصحاب تھے جن کی سر کردگی سر سید احمد خان جیسی سر بر آوردہ شخصیت کے ہاتھ میں تھی۔

سر سید احمد خان جنگ آزادی سے قبل ہی اس نتیجہ تک پہنچ چکے تھے[9] کہ مسلمانان بر صغیر کی بقا کا محض ایک ہی راستہ ہے کہ جدید علو م کو حاصل کیا جائے اور ماضی سے تعلق یکسر ختم کر دیا جائے۔ جنگ آزادی میں ناکامی او ر اس کے بعد مسلمانوں کے لیے جب اپنی بقا اور تشخص کو برقرار رکھنا بھی دشورا ہو گیا تو ان کی یہ رائے ایک مکمل فکر میں ڈھل گئی۔ اس حوالے سے یہ اقتباس ملاحظہ کیا جا سکتا ہے:

> ''جو شخص اپنی قومی ہمدردی سے اور دُور اندیش عقل سے غور کرے گا کہ ہندوستان کی ترقی… کیا علمی، کیا اخلاقی… صرف مغربی علوم میں اعلیٰ درجے کی ترقی حاصل کرنے پر منحصر ہے۔ اگر ہم اپنی اصلی ترقی چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی مادری زبان تک کو بھول جائیں۔ تمام مشرقی علوم کو نسیاً منسیاً کردیں (یعنی بھلادیں، مٹادیں)۔ ہماری زبان یورپ کی اعلیٰ زبانوں میں سے انگلش یا فرنچ ہوجائے۔ یورپ ہی کے ترقی یافتہ علوم دن رات ہمارے دست مال ہوں۔ ہمارے دماغ یورپین خیالات سے (بجز مذہب کے) لبریز ہوں۔ ہم اپنی قدر، اپنی عزت کی قدر خود کرنا سیکھیں، ہم گورنمنٹ انگریزی کے ہمیشہ خیر خواہ رہیں اور اسی کو اپنا محسن سمجھیں"[10]۔

اسی موضوع پر ایک اور جگہ انھوں نے یوں روشنی ڈالی:

> ''ہم صاف صاف کہنا چاہتے ہیں کہ ہم کو علومِ مشرقی کی ترقی کے پھندے میں پھنسانا ہندوستانیوں کے ساتھ نیکی کرنا نہیں ہے بلکہ دھوکے میں ڈالنا ہے"۔[11]

---

[9] ''ہندوستان میں برٹش گورنمنٹ خدا کی طرف سے ایک رحمت ہے۔ اس کی اطاعت اور فرماں برداری اور پوری وفاداری اور نمک حلالی، جس کے سایہ وعاطفت میں ہم امن وامان سے زندگی بسر کرتے ہیں، خدا کی طرف سے ہمارا فرض ہے۔ میری رائے آج کی نہیں بلکہ پچاس ساٹھ برس سے اسی رائے پر قائم ہوں''۔ضیاالدین لاہوری،افکارِ سرسید۔(لاہور:2006)،242۔

[10] ضیاالدین لاہوری،افکارِ سرسید۔ص207، مقالات سرسید ج5، ص،66

[11] ایضا"ص ۲۰۷

اپنی مقامی زبان تک بھول جانے کی دعوت دینے والی فکر یقینی طور پر اسی کی ہو سکتی ہے جو اپنی تہذیب کے تمام گوشوں سے آخری حد تک مایوس ہو چکا ہو۔ بعد کی زندگی انھوں نے اپنے اس خواب کو متشکل کرنے میں گزار دی۔اپنی اس کوشش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے انھوں نے روایتی مذہبی فکر کا ایک جواب دعویٰ (Anti- Thesis) تیار کیا۔ لیکن اس جواب دعویٰ کی ساری بناء انھوں نے فکر مغرب سے مستعار لی۔ اگر اس کی بنیادیں انھوں نے ہماری اپنی تہذیب میں موجود اوضاع کو استعمال کرتے ہوئے اٹھائی ہوتی تو اس کے نہ صرف یہ کہ ظاہری شکل مختلف ہوتی بلکہ وہ بحیثیت مجموعی قوم کے لیے زندگی کا پیغام لے کے آتا اور اس کے نتیجے میں یقینی طور پر ہماری تہذیبی موت نہ واقع ہوتی۔اس حوالے سے ان کے ہاں احساس کمتری کس درجے کو پہنچا ہوا تھا اس کا اندازہ اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

> ''وہ زمانہ جس میں انگریزی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی، ایک ایسا زمانہ تھا کہ بے چاری انڈیا بیوہ ہوچکی تھی۔ اس کو ایک شوہر کی ضرورت تھی۔ اس نے خود انگلش نیشن کو اپنا شوہر بنانا پسند کیا۔ انگلش نیشن ہمارے مفتوحہ ملک میں آئی مگر مثل ایک دوست کے، نہ کہ بطور ایک دشمن کے[12]''۔

یہاں نہایت واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے کہ مغربی استعمار کے حوالے سے سر سید احمد خان کی سوچ کیا تھی۔ یہ اسلوب ان کی تحریروں میں جا بجا ملتا ہے۔ سرسید احمد خان جب برطانیہ تشریف لے گئے تو مقصد ان کا انتہائی اعلیٰ تھا کہ رسول اکرم ﷺ کے حوالے سے ولیم مور کی لکھی گئی کتاب کا جواب دیا جائے۔ اس سفر کے اخراجات کے لئے انھوں نے اپنی جا ئیداد تک فروخت کرنے سے گریز نہیں کیا۔ لیکن اس سفر میں بھی وہ برطانوی تہذیب سے مزید متاثر ہو کر واپس لوٹے۔ حتیٰ کہ وہاں کی گھریلو ملازمائیں تک ان کو تہذیب و شائستگی کا اعلیٰ ترین نمونہ نظر آئیں اور ہندوستان کے وہ لوگ جو مقامی تہذیب کی ٹکسال میں ڈھلے ہوئے تھے وہ بھی ان کے مقابلے میں

[12] ایضا"۔ ص238

جانور سے بھی بدتر نظر آئے۔ اس حوالے ان کے نقطہ نظر کا مطالعہ ان کے سفرنامہ "مسافران لندن" میں ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔ مندرجہ ذیل عبارت اس حوالے سے دیکھی جا سکتی ہے:

> "میں بلا مبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے غریب تک، سوداگر سے اہل حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک، انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلے میں در حقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے نہایت لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ "[13]

مزید براں فکر مغرب سے بھی جو کچھ انھوں نے لیا وہ محض سطح پر نظر آنے والے افکار و تعقلات (Discourses) تھے اور کسی طور بھی اس فکر کو مغربی فکر کا ایک مشرقی ایڈیشن نہیں کہا جاسکتا۔ یعنی خود مغربی فکر میں جو گہرائی تھی اس کا بھی مطالعہ کیے بغیر محض سائنس ہی کو مغرب کی ترقی کی بنیاد قرار دیا اور اس کی دریافتوں اور چند نظریات کو حتمی حقائق سمجھتے ہوئے مذہبی عقائد کو بھی انھیں محدود پیمانوں پر پرکھنا شروع کر دیا۔ جبکہ خود مغرب ان نظریات کے حوالے سے مسلسل ایک ارتقائی عمل سے اس وقت بھی گزر رہا تھا اور آج بھی اس حوالے سے اس قدر قطعیت بیشتر سنجیدہ حلقوں میں سائنس کے حوالے سے نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ انھوں نے خدا کا جو تصور قائم کیا وہ نہ تو کسی وحی کی روشنی میں وجود میں آیا تھا اور نہ ہی ہماری تہذیب کے ساتھ اس کی کچھ مناسبت تھی بلکہ مغربی فکر کے بھی اس حصے سے مستعار لیا گیا تھا جو سائنس کی بنیاد پر خدا اور وحی کو لغویات قرار دے چکی تھی۔ اسی وجہ سے سر سید احمد خان نے نے جب اسلامی عقائد کی توضیح و تشریح شروع کی تو ان کے سامنے معیار حق محض حسیات پر مبنی نظریہ علم اور سائنسی نظریات تھا لہٰذا اسی پر انھوں نے مذہب کے دیئے ما بعد از طبیعاتی اور مافوق المادیاتی حقائق کو پرکھنا شروع کر دیا۔ اب چونکہ اس محدود معیار پر ان کی تصدیق و توجیہ ممکن نہ تھی لہٰذا اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ وہ ان تمام حقائق کی یا تو عقلی توجیہ کرتے یا پھر ان کا یکسر انکار ہی کر دیتے۔ چنانچہ ان کا قائم کردہ تصور خدا آزاد اور قادر مطلق نہیں بلکہ قوانین فطرت کا محتاجی کی حد تک پابند تھا۔ معجزے جو

---

[13] سر سید احمد خان، مسافران لندن۔ (علی گڑھ :مسلم یونیورسٹی، 2009) 170

قرآن نے بیان کئے ان سب کی انھوں نے سائنسی توجیح کی۔ فرشتوں کے وجود کا انکار کیا اور وحی کے روایتی تصور کو بھی غلط قرار دیا۔

یہ محض ان کے ذاتی افکار نہ تھے بلکہ ان کے رسالوں، مضامین و مقالاجات اور تعلیمی اداروں کے ذریعے مسلسل برسوں ان کی ترویج ہوتی رہی۔ کچھ ان افکار کے پیچھے موجود درد مندی اور قربانی کی وجہ سے اور کچھ خارج میں موجو د سازگار فضا کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کو ہاتھوں ہاتھ قبول کیا اور ایک پوری نسل ایسی تیار ہو گئی جو ماضی کے حوالے سےاحساس کمتری کا شکار اور اس سے اپنے ہر تعلق کو توڑنے پر آمادہ تھی۔ وہ نسل اپنے آبا کو برملا خبطی سمجھتی تھی اور دنیاوی ترقی اس کے سامنے سب سے بڑا مقصد تھا۔ انسان کیا ہے، اس کا مقصد حیات کیا ہے، دنیاوی زندگی کی حقیقت کیا ہے ان تمام سوالوں کے حوالے سے روایتی تصورات اور بیانئے اس طبقہ سے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ مغربی تصور حیات (World View) نے لے لی۔ دیگر عوامل بھی بلاشبہ اپنی جگہ موجود تھے لیکن سب سے بڑی وجہ یہی تھی جس کی وجہ سے ہم سیاسی کے ساتھ ساتھ نظریاتی طور پر بھی مفتوح قوم بن گئے۔

مسلمانوں کے ساتھ یہ المیہ تاریخ میں پہلی مرتبہ ہوا کہ کسی قوم نے مسلمانوں کو فتح کیا اور ساتھ ہی نظریاتی سطح پر بھی فتح کر لیا۔ ورنہ تاتاریوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست اٹھانے کے باوجود مسلمانوں نے ان کے سامنے فکری اور اخلاقی میدانوں میں سپراندازی نہیں کی اور زمانے نے یہ حیرت انگیز منظر کھلی آنکھوں سے دیکھا کہ جو قوم مسلمانوں کو ہتھیاروں کے میدان میں شکست و ریخت سے دوچار کر چکی تھی بہت جلد اسلامی ثقافت، تمدن اور پیغام کے سامنے سربسجود ہو گئی۔ تاریخ شاہد ہے کہ بہت کم ایسا ہوا کہ فاتح قوم نے مفتوح کا دین قبول کر لیا ہو۔ بعد میں ترکان عثمانی، ترکان تیموری مدت تک برسر اقتدار بھی رہے، شاعر مشرق نے اس حیران کن تاریخی حقیقت کو اسطرح بیان کیا ہے۔[14]

[14] محمد اقبال، کلیات اقبال (لاہور، 2001) ص 220

ہے عیاں یورش تاتار کے افسانے سے

پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

سر سید اور ان کے رفقا نے اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں کے حوالے سے ان کی ملی زندگی میں گراں قدر خدمات انجام دیں اور بلاشبہ ان کو قومی سطح پر اپنے پاوں پر کھڑا کرنے کے حوالے سے اہم ترین کردار ادا کیا۔ اس حوالے سے ان کی خدمات کا یقینا ہم سب پر احسان ہے۔ لیکن ان کے اس احسان کو تسلیم کرتے ہوئے ایک سنجیدہ غور و فکر اس حوالے سے بھی ہونا چاہیے کہ احساس کمتری کی فضا میں بنی اس فکر کے مسلم سماج پر کیا منفی اثرات مرتب ہوئے۔ شیخ محمد اکرام نے اپنے اہم تحقیقی کام "موج کوثر" میں اس حوالے سے تفصیل سے کلام کرتے ہیں۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

"سرکاری ملازمت کو علی گڑھ کا اہم ترین عملی مقصد بنانے کا برا نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ایک پست درجے کی مادیت اور شیئیت پسندی پیدا ہو گئی"۔ [15]

اسی طرح ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ:

"وہ مطمع نظر کی پستی اور کیریکٹر کی کمزوری سے فقط اس قابل ہوئے کہ کسی معمولی دفتر کے کل پرزے بن جائیں یا اپنے بانیوں کے خیالات اور ان کی عظمت کا کوئی اندازہ کیے بغیر جو باتیں ان کے مخالف کہہ رہے تھے انھی کو زیادہ آب و تاب اور رنگ و روغن دے سکیں۔" [16]

یعنی جدید تعلیم تو علی گڑھ تحریک کے زیر اثر خوب پھیلی اور مسلمانوں کی عمومی حالت کو بہتر کرنے اور ان کو شکست و ریخت سے بچانے کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں لیکن یہ اپنے زیر اثر لوگوں میں زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لگن اور اس کے لئے قربانی کا جذبہ پیدا کرنے میں ناکام رہی۔ سر سید احمد خان سے یہ فکر پورے ہندوستان کے مسلمانوں میں پھیلا۔ منانچہ اس سے

---

[15] شیخ محمد اکرام، موج کوثر، (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ) ص 147

[16] ایضا"۔ ص ۱۴۸

ایک طرف تو مغربی علوم کی تحصیل کی ایک زور دار تحریک پیدا ہوئی تو دوسری طرف اس کے متاثرین کی زندگیوں کا آئیڈیل مغرب بنتا گیا۔ اکبر الہٰ آبادی[17] نے غالباً" اسی کیفیت کو یوں بیان کیا کہ:

ے چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں
بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے

اسی فکر اور طرز زندگی کے حاملین قوم کی ملی زندگی میں راہنمائی کے منصب پر فائز ہوئے اور یوں اکثر وبیشتر مسلمانوں کا انداز فکر انھیں سانچوں میں ڈھل گیا۔ اس طرح بیسویں صدی کے آغاز تک ہندوستان میں روایتی مذہبی نظریہ حیات اور طرز فکر کی باقاعدہ موت واقع ہو گئی اور ادھر بھی خدا، آخرت، روح اور حیات اخروی کی جگہ دنیاوی ترقی اور مادہ پرستی جیسے تصورات نے لے لی۔ اور ترقی کا تصور، انسان کہ حقیقت، اخروی زندگی وغیرہ کے حوالے سے روایتی تصورات نظروں سے اوجھل ہوتے چلے گئے اور مغربی فکر کے تحت مادی ترقی اور دنیاوی عروج ہی اصل مقصد حیات بن گیا۔اس فکر کا اس قدر غلغلہ ہوا کہ اس کے خلاف زندگی گزارنے کو نہ صرف دنیاوی حوالے سے فرسودگی

[17] اکبر الہ آبادی نے طنزیہ شاعری کے ذریعے تہذیب و فلسفہ مغرب کے خلاف بند باندھنے کی کتنی زبردست کوشش کی۔ ان کے اس کام کی اہمیت شاعر مشرق پر خوب روشن تھی اسی لئے علامہ اقبالؒ اپنے خطوط میں حضرت اکبرؒ کو اپنا پیر قرار دیتے، ان کا شرف نیاز حاصل کرنا چاہتے اور اپنا دل حضرت اکبرؒ کے سامنے چیر کررکھنا چاہتے تھے اقبال خودکو لاہور میں تنہا سمجھتے اور حضرت اکبرؒ کو وہ فرد واحد جانتے جس سے دل کھول کر اپنے جذبات کا اظہار کیا جاسکے۔وہ اکبر سے طویل خط لکھنے کی استدعا کرتے اور اس خواہش کو روحانی خود غرضی قراردیتے۔ وہ حضرت اکبرؒ کو پیر مشرق قرار دیتے تھے۔ حضرت اکبر کے بارے میں اقبال نے یہاں‌تک لکھا کہ "اگر کوئی شخص میری مذمت کرے جس کا مقصد آپ کی مدح سرائی ہو تو مجھے اس کا قطعاً رنج نہیں بلکہ خوشی ہے۔ خط و کتابت سے پہلے آپ سے جوارادت و عقیدت تھی ویسی اب بھی ہے اور انشاء اللہ جب تک زندہ ہوں ایسی ہی رہے گی"، اقبال نے چند اشعار حضرت اکبر کے رنگ میں بھی لکھے مگر عوام کی بدمذاقی نے اس کا مفہوم کچھ سے کچھ سمجھ لیا۔ اقبال کے خیال میں حضرت اکبر نے ہیگل کے سمندر کو ایک قطرہ(شعر)میں بند کردیا تھا واضح رہے کہ اقبال ہیگل کو بہ اعتبار تخیل افلاطون سے بڑا فلسفی تصور کرتے تھے حضرت اکبر کے خطوط سے اقبال پر غورو فکر کی راہیں کھلتیں اس لئے اکبر کے خطوط وہ محفوظ رکھتے۔ حضرت اکبر کے اشعار پڑھ کر اقبال کو شیکسپئر اور مولانا روم یاد آجاتے تھے اقبال شکوہ جواب شکوہ پر دس پندرہ سطور کا دیباچہ ناشر کے مطالبے پر حضرت اکبر سے لکھوانے کے خواہش مند تھے۔ (اقبال نامہ ، ص ۳۷۲، ۳۷۴، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۹۳، ۳۹۷ یک جلدی تصحیح و ترمیم شدہ ، اقبال اکادمی پاکستان ۲۰۰۵)۔

کی علامت سمجھا جاتا بلکہ دینی طور پر بھی غلط ٹھہرایا گیا۔لہٰذا یہ بات بالکل درست طور پر کہی گئی ہے کہ اس جدید اسلامی نظریہ حیات کے برصغیر میں بانی سر سید احمد خان ہیں۔

اقبال کا تصور مغرب اور اس کے اثرات

بیسویں صدی کے برصغیر میں سر سید احمد خان کے بعد اہم ترین شخصیت علامہ محمداقبال کی ہے۔ اگرچہ مسلمانوں کی مذہبی فکر پر اور بھی بہت سے مفکرین اثر انداز ہوئے اور اس کے فکری ارتقاء میں اپنا حصہ ڈالا لیکن اقبال کا اپنا ایک بلند مقام ہے۔ اثر پذیری اور قبول عام میں شاید ہی کوئی دوسرا اقبال کی ہمسری کر سکے۔ اقبال نہ صرف بحیثیت قومی شاعر بلکہ ایک آفاقی مفکر کے ہمارے اجتماعی لاشعوراور دینی نظام احساس کا ناگزیر حصہ ہیں۔ اگرچہ عملی میدان میں اقبال سے کما حقہ استفادہ تو نہیں کیا جاسکا۔ نہ تو ان کی شاعری ہمارے سماجی و علمی رویوں اور معیارات کی بنا تعمیر کر سکی اور نہ ہی ان کی نثر میں جس ضرورت کو پہچان کر ایک کوشش کا آغاز کیا گیا تھااس کی طرف خاص پیش قدمی ہو سکی۔ اقبال نے جس دور میں اپنے فکری سفر کا آغاز کیا تب مسلمانان برصغیر کواستعمار کے باقاعدہ زیر تسلط آئے قریباً نصف صدی گزر چکی تھی۔اس دوران جو نسل پروان چڑھ کر قومی سطح پر اپنا کردار ادا کر رہی تھی وہ الواسطہ یا بلا واسطہ فکری راہنمائی علی گڑھ ہی سے حاصل کرتی تھی۔مغرب کے حوالے سے ان کے تصورات احساس کمتری میں گندھے ہوئے اور اس حوالے سے ان کا طرز عمل معذرت خواہانہ تھا۔ خارجی فضا بھی مسلمانوں کو اسی طرز عمل کے اختیار کرنے کا درس دیتی تھی اور داخلی طور پر بھی مسلمانان برصغیر کے سامنے کوئی ایسی فکر یا ایسی زور دار شخصیت موجود نہ تھی جو ان کو اس فکری پراگندگی سے بچا سکتی جو مغرب کی اندھی تقلید سے پیدا ہو چکی تھی۔ اسلام کو ترک کرنا بھی مشکل تھا اور مغربی رنگ میں رنگا جانا ترقی کے لئے ضروری۔ لہٰذامنطقی نتیجہ اس کا یہی نکلا کہ مذہب اپنے یہاں ایک بڑے طبقے کی زندگیوں سے غیر متعلق ہوتا چلا گیا۔

اس پس منظر میں اقبال مسلمانان برصغیر کے لیے ایسے راہنما کے طور پر سامنے آتے ہیں جومغرب کو سمجھتا ہے، ان کے افکار کے حسن و قبح میں فرق کر سکتا ہے، ماضی سے ان کا تعلق بھی جوڑتا ہے، انھیں دین سے اٹوٹ وابستگی پر بھی آمادہ کرتا ہے او ر اس حوالے سے کسی احساس کمتری کا نہ خود

شکار ہوتا ہے نہ ہی اپنے مخاطبین کو ہونے دیتا ہے۔ اہلِ اسلام کوانہوں نے اس عہد کے مطالبات کی طرف، وقت سے پہلے متو جہ کیا۔انہوں نے اپنے دور کے علمی معیارات کو سامنے رکھا اور اس تشکیلِ نو کے مراد کو واضح کیا۔ ساتھ ہی یہ ابہام بھی نہیں رہنے دیا کہ وہ کوئی حرفِ آخر کہہ رہے ہیں۔ ان کا اصرار کسی خاص نتیجہ فکر پر نہیں تھا، غورو فکر کے استمرار پر تھا۔اپنی شاعری میں انھوں نے امت کی تشکیل نو اور پیکر خاکی میں جان پید اکرنے کی کوشش کی اور زندگی کا پیغام دیا۔

عام طور پر خیال یہی کیا جاتا ہے کہ وہ چونکہ جدید تعلیم یافتہ تھے لہٰذا فکر سر سید احمد خان ہی کا تسلسل تھے۔ لیکن بنظر غائر ان کی تعلیمات کا جائزہ لیا جائے تو تصویر کچھ مختلف بنتی ہے۔ وہ مغربی علوم کی اہمیت سے خوب آگاہ ہیں اور اس کی اہمیت پر زور بھی دیتے ہیں۔ نیز وہ سائنسی نظریہ علم پر دینی حقائق کو پیش کرنے کے حوالے سے جدید علم کلام کی اہمیت پر بھی زور دیتے ہیں۔ ان کے خطبات Reconstruction of Religious Thoughts in Islam اصل میں اسی سلسلے کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔خود اقبال نے مندرجہ ذیل الفاظ میں ان خطبات کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ:

> "I propose to undertake a philosophical discussion of some of the basic ideas of Islam, in the hope that this may, at least, be helpful towards a proper understanding of the meaning of Islam as a message to humanity."[18]

خصوصی طور پر پہلے اور آخری خطبے میں مذہبی مشاہدے کو بھی مستند ذریعہ علم ثابت کرنے کی کوش کی۔ آخری خطبہIs religion possible?میں سوال اٹھایا ہے کہ ان حالات میں کیا مذہب کا کوئی امکان ہے، یعنی اس تصور علم کے مطابق مذہب کی کیا حیثیت رہ گئی ہے جو کہ محض حسی مشاہدے تک محدود ہو گیا ہے، کیا اس میں مذہب کی بھی کوئی صورت باقی بچتی ہے یا کہ نہیں۔ خطبات میں اقبال نے دینی مسلمات کو مروجہ عقلی معیارات کے مطابق بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ ان کے خیال میں اب عقل جدید پرانے طرزاستدلا ل کو تسلیم نہیں کر سکتی۔ لہٰذا اگر جدید معیار کے

---

[18]M. Iqbal, *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, (I. A. P, Lahore, 1989) edited and annotated by Shaikh Muhammad Saeed

مطابق دین کو ثابت نہ کیا جا سکا تو دنیا میں دین کا وجود ختم ہو جائے گا۔ اقبال کی اس کوشش کے حوالے سے ڈاکٹر سہیل عمر مندرجہ ذیل الفاظ میں تبصرہ کرے ہیں:

"اقبال نے تشکیل جدید میں جس نئی الہیات کی بنیاد رکھی ہے اس کے پیچھے اقبال کے دو بنیادی تصورات کام کر رہے ہیں (۱) اقبال یہ جانتے ہیں کہ نیا انسان "محسوس" کاخوگر انسان ہے جسے "اس قسم کے فکر کی عادت ہو گئی ہے جس کا تعلق اشیاء اور حوادث کی دنیا سے ہے"۔ جس سے اقبال یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ اس انسان سے تعلق پیدا کرنے کے لیے ایک ایسے منہاج کی ضرورت ہے جو نفسیاتی اعتبار سے اس ذہن کے قریب تر ہو جو گویا محسوس کا خوگر ہو چکا ہے تاکہ وہ آسانی سے اسے قبول کر لے، اقبال کے نزدیک یہ کام اس قسم کے لوگ بالکل نہیں کر سکتے جو عصر حاضر کے ذہن سے بالکل بے خبر ہیں، اور اس لیے موجودہ دنیا کے افکار اور تجربات سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے(۲) پرانا طریق کار اس لیے بیکار ہے کہ الٰہیات کے وہ تصورات جن کو اب ایک ایسی مابعد الطبیعیات کے الفاظ و اصطلاحات میں پیش کیا جاتا ہے جو مدت ہوئی عملاً مردہ ہو چکی ہے ان لوگوں کی نظر میں بیکار ہیں جن کا ذہنی پس منظر یکسر مختلف ہے۔ چنانچہ ان دونوں حقیقتوں کے پیش نظر اقبال کہتے ہیں' 'ہم مسلمانوں کو ایک یہ بڑا کام درپیش ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ماضی سے اپنا رشتہ منقطع کئے بغیر اسلام پر بحیثیت ایک نظام فکر از سر نو غور کریں" اب چونکہ عصر حاضر کے انسان سے وہ انسان مراد ہے جو مغربی تہذیب سے پیدا ہوا ہے اس لیے اقبال کی نئی الہیات کی تشکیل کی کوشش کا حقیقی مقصد مغربی اور اسلامی تہذیب کے درمیان مشترکہ عناصر کی جستجو ہے اور وہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلام اور اسلامی تہذیب میں کوئی ایسی بات نہیں ہے" جو محسوس کے خوگر" انسان کے ذہن کے مطابق نہ ہو"۔[19]

مغربی علمی معیارات کے مطابق جدید علم کلام کی تشکیل کی ضرورت کی حد تک اقبال سر سید احمد خان کے ہم رکاب ہی نظر آتے ہیں اور ان پہلوؤں سے وہ بلا شبہ فکر سر سید ہی کا تسلسل قرار دیئے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایسے بہت سے پہلو ان کی(اقبال) فکر میں البتہ ایسے ہیں جن میں وہ سر سید کے بالکل مختلف بلکہ متضاد نکتہ نظر کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ اس حوالے ان کے افکار سے محض چند نمونے سطور زیریں میں پیش کئے جائیں گے۔

---

[19] سہیل عمر، خطبات اقبال نئے تناظر میں۔(لاہور:اقبال اکیڈمی)۳

اقبال مسلمانوں کے زوال کے حوالے سے سر سید کے بنیادی تجزیہ ہی سے اتفاق نہیں کرتے[20]:

؎ سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے!
زوال بندہ مومن کا بے زری سے نہیں

اقبال کا مغرب کا مطالعہ سطحی نہیں تھا اسی وجہ سے وہ مغربی علوم کو انسانیت کے لئے ہلاکت آفریں سمجھتے تھے۔ ان کا اس حوالے سے اپنا دعویٰ بالکل صداقت پر مبنی ہے کہ :

؎ عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں

کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل[21]

ایک اور جگہ اس تہذیب کا کھوکھلا پن اور علوم کے انسانیت کو نفع پہنچانے کی صلاحیت سے عاری ہونے پر یوں طنز کیا :

؎ یہی آدم ہے سُلطاں بحر و بَر کا
کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا
نہ خود بیں، نےَ خدا بیں نے جہاں بیں
یہی شہکار ہے تیرے ہُنر کا[22]!

یعنی جدید انسان کا جو نظریہ حیات ہے وہ نہ تو خود انسان کو اس کی حقیقت سے آگاہ کرتا ہے نہ ہی خدا تک لے کے جاتا ہے اور نہ ہی کائنات سے متعلق اس کو کوئی حتمی تصور دیتا ہے۔ سائنس جس کے حوالے سے اس دور میں بھی اور آج بھی مسلمان احساس کمتری کا شکار ہیں اورایک بڑا طبقہ مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی سے نکلنے کا واحد حل ہی سائنس میں ترقی کو قرار دیتا ہے۔ جبکہ خود مغرب میں بہت سے سنجیدہ اصحاب دانش یہ نقطہ نظر رکھتے ہیں کہ سائنس نے انسان کو کس طرح

---

[20] محمد اقبال، کلیات اقبال (لاہور: اقبال اکیڈمی) ۵۳۲
[21] ایضا"، ص ۳۹۱
[22] ایضا"، ص ۴۱۳

روحانیت اور اخلاقیات سے دور کر دیا ہے اور کس طرح اس کی وجہ سے معاشروں میں بہت سے انسانی المیوں نے جنم لیا ہے۔ اس حوالے سے اقبال کہ مندرجہ ذیل اشعار تو بالکل الہامی محسوس ہوتے ہیں کہ اس اسلوب اور اس کاٹ کے ساتھ سائنس پر نقد آج بھی مشکل ہے تو اس دور میں تو یہ اور بھی مشکل کام تھا۔

ؔ 'عشق ناپید و خرد میگزدش صُورتِ مار'
عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھُونڈنے والا ستاروں کی گزر گاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حِکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شُعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا[23]!

جدید مغربی تہذیب کا ایک اہم ستون سرمایہ دارانہ نظام اور اس کے بطن سے پھوٹی ہوئی افادیت پسندی اور مادہ پرستی ہے۔ یہ بات پہلے بیان کی جا چکی ہے کہ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر لوگوں کی زندگی کا مطمح نظر محض ملازمت کا حصول بن کے رہ گیا اور زندگی میں آگے سے آگے بڑھنا ہی مقصد حیات قرار پایا۔ یقیناً یہ طرز عمل اس وقت مسلمانوں کی بقا کے لئے ضروری تھا لیکن اس کا مستقل ہماری زندگیوں کا حصہ بن جانا ایک زہر قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اقبال کے ہاں اس حقیقت کا اظہار ہمیں یوں ملتا ہے:

ؔعصرِ حاضر مَلک الموت ہے تیرا، جس نے
قبض کی رُوح تری دے کے تجھے فکرِ معاش
دل لَرزتا ہے حریفانہ کشاکش سے ترا

[23] ایضا"، ص ۵۸۳

زندگی موت ہے، کھو دیتی ہے جب ذوقِ خراش
اُس جُنوں سے تجھے تعلیم نے بیگانہ کیا
جو یہ کہتا تھا خرد سے کہ بہانے نہ تراش

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ[24]

مذکورہ بالا اشعار میں جہاںمغربی مادہ پرستی کو موت قرار دیا گیا ہے وہیں جدید نظام تعلیم پر بھی گرفت کی گئی جو انسان کو اس کی تخلیق کے اصل مقصد سے بیگانہ کر دے۔ اقبال نے اور بھی بہت سے مقامات پر علم جدید کے انسانیت کے لئے ہلاکت آفریں ہونے کو بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کی نظم "پیر و مرید" کا مندرجہ ذیل حصہ خاص طور پر قابل ذکر ہے[25]۔

مریدِ ہندی

چشمِ بینا سے ہے جاری جُوئے خُوں　　علمِ حاضر سے ہے دِیں زار و زبُوں!

پیرِرُومی

علم را بر تن‌زنی مارے بود　　علم را بر دل‌زنی یارے بود

مریدِہندی

اے امامِ عاشقانِ دردمند!　　یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند
خُشک مغز و خشک تار و خشک پوست　　از کجا می آید ایں آوازِ دوست،
دَورِ حاضر مستِ چنگ و بے سُرور　　بے ثبات و بے یقین و بے حضور
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا　　دوست کیا ہے، دوست کی آواز کیا
آہ، یورپ بافروغ و تاب ناک　　نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

---

[24] ایضا"، ص ۵۹۶
[25] ایضا"، ص ۴۶۲

پیرِ رومی

بر سماعِ راست ہر کس چیر نیست　　　طعمۂ ہر مُرغکے انجیر نیست

مریدِ ہندی

پڑھ لیے مَیں نے علومِ شرق و غرب　　　رُوح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیرِ رومی

دستِ ہر نا اہل بیمارت کُند　　　سُوئے مادر آ کہ تیمارت کُند

ان اشعار میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ اقبال کا درس تو "سوئے مادر" آنے کا ہے نہ کہ مغرب کی چکاچوند سے متاثر ہو کر اس کی اندھی تقلید میں بھاگتے چلے جانا[26]۔ اپنی شاعری میں تہذیب مغرب پر نقد کے ساتھ ساتھ اقبال اس کی موت کی بھی پیش گوئی کرتے ہیں۔ [27]

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زرِ کم عیار ہو گا

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خود کُشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہو گا

مغربی تہذیب، مادہ پرستی، آزادی نسواں، انسان کا معاشی حیوان بن جانا ایسے موضوعات پر نقد اقبال کے پورے کلام میں جابجا ملتی ہے۔ سطور بالا میں اردو شاعری کے حوالے دیئے گئے لیکن ان کا فارسی کلام بھی اس حوالے سے انتہائی اہم ہے۔ اس حوالے سے "اسرار و رموز"، "پس چہ باید کرد" اور " جاوید نامہ" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

---

[26] نظر کو خِیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی　　　یہ صنّاعی مگر جھُوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے
(ایضا"، ص ۳۲۵)

[27] ایضا"، ص ۱٦۷

مغربی تہذیب پر نقد اور اس کے زوال کی پیش گوئی کے ساتھ ساتھ اقبال امت مسلمہ کے دوبارہ عروج کا بھی ذکر جابجا کرتے ہیں[28]۔

آسماں ہو گا سحَر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظُلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

اس طرح ایک اور جگہ فرمایا[29]:

کتابِ مِلّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

غرض اقبال مسلمانوں کو مغربی تہذیب سے تعامل کا ایک پورا لائحہ عمل دیتے ہیں اور ان کو فکری پسماندگی سے نکل کر دنیا میں مردانہ وار زندگی گزار کر ملت اسلامیہ کو دوبارہ عروج دلانے کا سبق بھی دیتے ہیں نیز ان کے ہاں امید کا درس ملتا ہے جو مسلمانوں کی موجودہ پستی کی وجہ سے پیدا ہونے والی مایوسی کا موثر علاج بن سکتا ہے۔ ان کے چند تفردات کو چھوڑ کر بلاشبہ ان کی فکر میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جو دور حاضر میں اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل کے لئے ضروری ہیں اور جب بھی اس حوالے سے سنجیدگی سے کام کیا گیا تو ان کی فکر سے استفادہ ایک لازمی امر ہو گا۔ خاص طور پر برصغیر کے مسلمانوں کے لئے ان کے کام کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔

[28] ایضا"، ص ۲۲۲

[29] ایضا"، ص ۲۹۸

حاصل کلام

سر سید اور اقبال دونوں کے برصغیر کے مسلمانون پر لاتعداد احسانات ہیں۔ دونوں نے خلوص نیت سے مسلمانوں کو پستی سے نکالنے کے لئے ایک لائحہ عمل تجویز کیا اور پھر اس کے حصول کے لئے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر دیں۔ ان کے کسی نتیجے سے اختلاف البتہ کیا بھی جا سکتا ہے اور بعض صورتوں میں ناگزیر بھی ہے۔ قوموں کی اجتماعی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنے ماضی کا کس قدر درست تجزیہ کرتے ہوئے اپنے لئے مستقبل کا راستہ اخذ کر سکیں۔ جہاں تک اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل کا تعلق ہے تو صفحات گذشتہ میں کی گئی بحث سے یہ بات عیاں ہے کہ سر سید احمد خان کے تصورات ان کے دور میں ہمارے لئے کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں وہ دور حاضر میں اسلامی نظریہ حیات کی تشکیل کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ نہ تو وہ ہماری تہذیب کے تمام تصورات کا احاطہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی مغرب خود ان کے حوالے سے حتمی رائے قائم کئے ہوئے ہے۔ وہ سائنس جس پر تکیہ کرتے ہوئے سر سید نے عقائد تک کے تار و پود بکھیر کر رکھ دیئے وہ سائنس خود نئی منزلوں کے سراغ میں پچھلے نظریات سے رجوع کر چکی۔ لہٰذا یہ لازمی امر تھا کہ سر سید کے نتائج فکر بھی اپنی اطلاقیت (validity)اور relevance کھودیتے۔ اس حوالےسے سلیم احمد نے اپنے ایک مضمون میں بھرپور تبصرہ کیا ہے جو اس پوری صورتحال کا کامل احاطہ کرتا ہے۔

> "سر سید بہت بڑے بوتے کا آدمی تھا اور سر سید نے جو کر دیا وہ کسی سے نہ ہو سکا۔ اکبر بھی ساری زندگی مخالفت کرنے کے باوجود مان گئے کہ سید کام کرتا تھا۔ کام کے طریقے، ذرائع اور حدود پر مجھے اعتراض ہے۔ کام کے مقصد اور نیت پر نہیں وہ مسلمانوں کے سچے بہی خواہ تھے اسلام کے حقیقی مصدق تھے۔ البتہ ان کے عمل نے ان کی نیت اور مقصد سے آزاد ہو کر ایسے نتائج پیدا کئے جن سے اختلاف ہو سکتا ہے۔ مجھے اختلاف ہے بھی مگر یہ اختلاف بھی دوسروں سے مختلف ہے۔ ایک وقت تھا جب ہمیں ایسے نتائج کی ضرورت تھی۔ ہم نے ان نتائج سے کام لیا اور زندہ رہے۔ زندہ رہے اور جہاد کیا۔ جہاد کیا اور انگریزوں کو نکال بھگایا۔ روح ہندوستان اس جنگ میں ہمیشہ سر سید کے پیدا کیے ہوئے سپاہیوں کی ممنون منت رہے گی۔ میرا اختلاف یہ نہیں ہے کہ وہ نتائج ایک وقت میں کیوں پیدا ہوئے۔ ان کا پیدا ہونا تاریخی تقاضا تھا۔ اختلاف یہ ہے کہ وہ نتائج اب بھی کیوں برقرار ہیں۔ اب ہم زندگی کی نئی منزلوں میں ہیں۔ ہمیں اب ایک دوسرے طریقہ کار اور حکمت کی ضرورت ہے ہم اب

> بالکل دوسرے نتائج پیدا کرنے چاہتے ہیں۔ چنانچہ سر سید جو کبھی ہمارے لیے سنگ میل تھے۔ اب سنگِ راہ ہیں۔ اب وہ راستہ نہیں دکھاتے گمراہ کرتے ہیں۔ منزل رسی میں مدد نہیں دیتے۔ رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ تاریخ کا تقاضا ہے کہ اس سنگ راہ کو اکھاڑ پھینکا جائے اس کی اپنی وقتی اور تاریخی اہمیت اور ضرورت کا اعتراف کر کے اس کو ٹھوکر مار دی جائے اور آگے بڑھا جائے۔ سر سید زندہ ہوتے تو مجھے حق الیقین ہے کہ جو لوگ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی تائید کرتے۔ شاید ان میں سے پھر کوئی مسدس مدو جزر اسلام قسم کی کوئی چیز لکھ ڈالتا اور سر سید اسے بھی اپنا وسیلہ نجات بنا لیتے"۔[30]

یہ ایک المیہ ہے کہ آج بھی مغرب کے حوالے سے سر سید کے اخذ کردہ نتائج فکر موجود ہیں اور اپنے یہاں اس رویئے کا دور دور تک کوئی اظہار نہیں ملتا جس کی تلقین اقبال نے کی۔ بلکہ وہ لوگ جو سر سید سے بغض کی حد تک اختلاف کرتے ہیں وہ بھی زندگی کے انھیں تصورات کو ذہناً اور عملاً قبول کر چکے جن کی طرف راہنمائی سر سید مرحوم نے کی تھی۔ انسانی زندگی کی حقیقت اور اس میں تصور آخرت کی مرکزی حیثیت، ترقی کا تصور،زندگی کے مقاصد، غرض ہر چیز مغربی تہذیب کی چکاچوند سے متاثر ہےاور مذہبی طبقات سمیت سماج آج بھی مغرب کے ظاہری روشن چہرے کے اندر چھپی ہوئی تاریکی کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ اگرچہ اقبال کو قومی شاعر کا درجہ دے کر اور اس کا بت بنا کر پوجنے والے اب بھی وافر تعداد میں موجود ہیں اور کبھی بھی اس حوالے سے ہم تہی دامن نہیں رہے لیکن اقبال کی فکر کے وہ عناصر جو ہمیں مغرب سے تعامل کا لائحہ عمل دیتے ہیں، جن کی روشنی میں سماج کی تعمیر کی جاسکتی ہے، نظام تعلیم مرتب کیا جا سکتا ہے، نظام اخلاق کی تدوین نو ہو سکتی ہے، خدا، انسان اور کائنات سے متعلق مذہبی تصورات کو جدید دور کے تقاضوں کے مطابق بیان کیا جاسکتا ہے، آج تک ان سے کما حقہ استفادہ نہیں کیا جا سکا۔ یعنی عملًا اس حوالے سے کیا مذہبی اور کیا سیکولر سب کے سب مغرب کے سامنے سجدہ ریز ہی نظر آتے ہیں۔ ممکن ہے اس بیان کو مبالغہ سمجھا جائے لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ آج بھی ہمارے ہاں تعلیم کا مقصد سائنس کی تعلیم ہی ہے اور سماجی علوم میں دیا جانے والا تناظر اور تصور انسان عین وہی ہے جو ہمیں جدید مغربی علوم عطا کرتے ہیں۔

---

30 سلیم احمد، مضامین سلیم احمد ۔(کراچی: اکادمی بازیافت، 2009) 290

کتابیات

احمد، منظور، اقبال شناسی،ادارہ ثقافت اسلامیہ،لاہور،2002۔

احمد، سلیم، مضامین سلیم احمد۔ کراچی: اکادمی بازیافت، کراچی، 2009۔

اکرم، شیخ محمد، موج کوثر،ناظم ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور،2007۔

اقبال، محمد، اسرار ورموز،اقبال اکیڈمی،لاہور،1940

______، کلیات اقبال۔ اقبال اکیڈمی، لاہور

______، *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*، لاہور،1968۔

انصاری، اسلم، تاریخ،نظریہ،مشمولہ: دائرہ معارف اقبال، جلد: 1،شعبہ اقبالیات،پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج،لاہور،2006۔

صابر، ڈاکٹر ایوب، محمد سہیل عمر،علامہ اقبال کاتصور اجتہاد،اقبال اکادمی،لاہور،2008۔

عبداللہ، ڈاکٹر سید، مطالعہ اقبال کے چند نئے رخ، بزم اقبال، لاہور،1999۔

عبد الحکیم، ڈاکٹر خلیفہ، فکر اقبال،بزم اقبال،لاہور،1992۔

فراقی، ڈاکٹر تحسین، اقبال چند مباحث،اقبال اکامی پاکستان،لاہور1997۔

لاہوری، ضیاءالدین، آثار سرسید،اشتیاق اے، مشتاق پریس،،لاہور،2007۔

______، نقش سرسید، اشتیاق اے، مشتاق پریس،،لاہور،2006۔

ندوی، ابوالحسن علی، انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر، مجلس نشریات اسلام، کراچی، 1986۔